شاہد منصور

افواہیں

یہ سچ ہے کہ سارے آدمی ایک رائے پر متفق نہیں ہو سکتے۔ اپنے خیال میں ہر شخص سچ ہی بولتا ہے اور آپ بقول والیٹر کسی کو بھی سچ بولنے کی آزادی سے محروم نہیں رکھ سکتے تو یقیناً آپ نے ابن صفی کے بارے میں اس طرح کے خوفناک "سچ" ضرور سنے ہوں گے (اور اگر یہ نہ سنے ہوں تو مجھے آپ کی خوش ذوقی پر شک ہے صاحب)

"ابن صفی..... ابن صفی جیسا خوش گفتار خوش بیان خوش مزاج ہم نے دیکھا ہی نہیں۔ گفتگو کیا کرتا ہے۔ ظالم۔ منہ زبانی انشا پردازی کرتا چلا جاتا ہے۔"

"نہیں صاحب ابن صفی جیسا نفس آدمی تو دیکھا ہی نہیں رنگین بیانی تو چھو کر بھی نہیں گزری گفتگو کیا کرتا ہے بازار کے بھاؤ سناتا ہے۔"

"ابن صفی جیسا جوان رعنا مشکل سے ہی دکھائی پڑے گا۔ کتابی چہرہ، صبیح رنگت۔ سنہرے بال، بادام جیسی سیاہ مخملیں آنکھیں جن میں بیکراں جھیلوں جیسی گہرائی۔"

"ارے صاحب..... آپ نے ابن صفی کے بجائے چغتائی کی کوئی تصویر تو نہیں دیکھ لی۔ وہ تو میرے بھائی بے حد کالا ہے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹے موٹے ہونٹ اسی احساس کمتری کی وجہ سے وہ مصنف بن بیٹھا ہے۔"

"میاں ابن صفی کی کیا پوچھتے ہو راجا اِندر ہے راجا اِندر۔ دن حسینوں کی صحبت میں کٹتے ہیں اور رات پری جمالوں کی۔ اللہ ایسا نصیبہ ہر ایک کو دے۔"

"پاگل ہوئے ہو۔ اس جیسا متقی اور پرہیز گار آدمی دور دور تک نہیں ملے گا۔ پنج وقتہ نمازی تہجد گزار پرہیز گار پابند صوم و صلواۃ۔"

"تو پھر صاحب آپ ابن صفی سے ملے ہی نہیں شراب تو وہ پانی کی طرح پیتا ہے۔ پینے کے معاملے میں بالکل....."

"جوزف" ہے۔ بوتلوں پر بوتلیں خالی ہو جاتی ہیں مگر کیا مجال ہے کہ ذرا نشے کا گمان بھی ہو جائے۔ ابھی پچھلے اتوار کو میں خود اس کے ساتھ تھا جب پیرڈائز بار میں رات کے گیارہ بجے....."

"لاحول ولا قوۃ۔ غلط بیانی کی بھی حد ہوتی ہے۔ اس غریب نے تو ساری زندگی شراب کی صورت بھی نہ دیکھی ہو گی اور پچھلے اتوار..... پچھلے اتوار کو تو وہ شام سے ہی میرے ساتھ حضرت شاہ مستان اولیا کی درگاہ پر قوالی سن رہا تھا۔ پوری رات ہم وہیں رہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے نہ جانے کتنا روپیہ میرے ہاتھ سے ہی قوالوں۔"

"بس بس .... اس جیسا کنجوس آدمی تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ دانتوں سے پیسہ پکڑتا ہے دانتوں سے۔ تبھی تو اتنا بینک بیلنس ہے فلم بھی تو بنا رہا ہے۔"

"پیسہ اور ابن صفی کے پاس۔ خواب دیکھا ہو گا بھائی اس کے ہاتھوں میں تو سوراخ ہیں سوراخ۔ کتنا بھی آجائے اس کے پاس ٹکتا ہی نہیں۔ ابھی پچھلے ہفتے مجھ سے دس ہزار کا چیک۔"

"ہاہاہا..... یہ اس سال کا سب سے عمدہ لطیفہ ہے۔ میاں حاجت مندوں کی تو خود اس کے یہاں قطاریں بندھی رہتی ہیں جو کچھ کماتا ہے سب بیواؤں اور یتیموں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس کے بیوی بچے۔"

"بیوی بچوں کا تو نام نہ لو۔ باپ نے زبردستی گلے میں باندھ دی تھی۔ شریف آدمی ہے بیچارہ بھگت رہا ہے۔ خود اس غریب نے اس دن آنکھوں میں آنسو بھر کر مجھ سے۔"

"نہیں صاحب اس جیسا بیوی سے محبت کرنے والا اور بچوں پر جان چھڑکنے والا میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ جب اس دن میں اس کے گھر گیا تھا تو میں نے اپنی آنکھوں سے خود۔"

"ہاں صاحب اگر وہ ایسا ہی بیوی کا وفادار ہوتا تو فلاں صاحب کی لونڈیا کے عشق میں خودکشی کیوں کرنے کی کوشش۔"

"بیوقوف ہیں آپ خودکشی کہاں۔ وہ تو پاگل ہو گیا تھا جب اس کی محبوبہ نے بے وفائی کی تھی۔"

"نہیں صاحب عشق وشق نہیں.....وہ تو چلہ الٹ گیا تھا۔"

"کچھ بھی ہو لکھتا خوب ہے۔"

"ہاں اسی خوش فہمی میں رہیے۔ اچھا ہے۔"

"تو آپ لکھ کر دیتے ہیں۔"

"آپ یقین نہیں کرنا چاہتے تو نہ کریں کاش آپ نے میری تحریر دیکھی ہوتی۔"

"دیکھی ہوتی تو کیا ہوتا۔"

"آپ خود مانتے کہ اس کی تحریر میں جو رنگینی اور روانی ہے وہ میرے علاوہ۔"

"آپ کے باپ نے بھی کبھی لکھا ہے۔"

❁

فاضل اجل علامہ دہر حضرت قبلہ نانا فرنویس کا قول ہے (قول تو خیر یہ میرا ہی ہے مگر شاید اسے آپ اس طرح زیادہ وقعت دے سکیں) کہ آدمی کی معراج یہ ہے کہ مرنے کے بعد وہ

شخصیت سے افسانہ بن جائے اور جو تاریخ میں یہ بہت ساری شخصیتوں کے سروں کے گرد آپ کو جگمگاتے ہوئے سنہرے ہالے نظر آتے ہیں۔ یہ افسانوں کا ہی شاخسانہ ہیں۔ ابن صفی اس لحاظ سے خاصا خوش قسمت ہے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں افسانہ بن چکا ہے۔ اس کے متعلق اڑائے ہوئے..... سنسنی خیز افسانوں کو اگر کوئی اللہ کا بندہ جمع کرسکے تو ان سے ایک راتوں کی نیند حرام کردینے والا بے حد دلچسپ "مجادلاتی" ناول تیار ہوسکتا ہے۔ "مجادلاتی" کی ترکیب پر چونکنے کی ضرورت نہیں کیونکہ جب آپ صرف سچ معلوم کرنے کی معصوم سی خواہش کو پورا کرنے کے لیے ان رنگین افسانوں کو ابن صفی کی زندگی کی سادہ حقیقتوں سے ٹکرائیں گے تو آپ کو شدید مایوسی ہوگی اور اس مایوسی کی جھنجلاہٹ اگر افسانہ نگار پر اتارنا چاہیں گے تو مجادلہ ضرور ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ معاملہ گرمی گفتار سے بڑھ کر سر پھٹول تک پہنچ کر قابل دست اندازی پولیس بن جائے اور ابن صفی کو اس پر بھی ایک ناول لکھنا پڑے۔

بعض صداقتیں بڑی ظالم ہوتی ہیں۔ آج ابن صفی پر لکھنے بیٹھا ہوں تو ان کا احساس ہورہا ہے۔ کسی کا قول ہے (نانا فرنویس کا نام نہیں لوں گا صاحب) کہ دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے۔ صرف نام و مقام اور کردار بدلتے رہتے ہیں۔ ابن صفی پر لکھتے ہوئے مجھے بھی وہی الجھن درپیش ہے جو منٹو مرحوم کو احمد ندیم قاسمی پر لکھتے ہوئے پیش آئی تھی۔ (چھوٹا منہ بڑی بات ضرور ہے مگر کیا کروں ہے متفق گردید رادے بو علی بارادے من) کہ پورے دو گھنٹے وقت ضائع کرنے اور کوفت کھانے کے بعد وہ قلم پھینکتے اور کاغذ پھاڑتے بولے کہ میں اس کے سوائے اور کیا لکھ سکتا ہوں کہ احمد ندیم قاسمی بے حد شریف آدمی ہے۔ تو اے صاحبو..... حقیقت یہی ہے کہ ابن صفی کے بارے میں بھی اس کے سوا کچھ نہیں بھی لکھا جاسکتا کہ ابن صفی بڑا شریف آدمی ہے۔ بڑا شریف آدمی ہے۔ بڑا..... شریف آدمی ہے۔ خدا میری مغفرت کرے میں بڑا خوش قسمت ہوتا اگر اسی جملے پر میری گلوخلاصی ہوجاتی اور یہ مضمون یہیں ختم ہوجاتا مگر مجھے ..... ہے کہ وہ ظالم جو اس رسالے کا مدیر اعلیٰ بھی ہے کبھی اس پر راضی نہ ہوگا اور مجھے لکھنا ہی پڑے گا۔

اب میری سمجھ میں آرہا ہے کہ ابن صفی سیدھے سادے اسرار احمد سے افسانہ کیوں بن گیا۔ لوگ جسے پسند کرتے ہیں جسے چاہتے ہیں۔ اس کے متعلق سب کچھ جان لینا بھی چاہتے ہیں محض اس فقرے سے کہ وہ بہت شریف آدمی ہے۔ وہ مطمئن نہیں ہوتے۔ اس مرحلے پر مجھ جیسے گمنام فنکار ممدوح کی شخصیت کے اس خلا کو اپنے افسانوں سے پر کرتے ہیں اور افسانوں کے..... بین السطور اور حاشیوں سے اپنی شخصیت کو ابھارنے اور سنوارنے کا کام لیتے ہیں اور صاحب یہ دھندا نیا نہیں ہے۔ یہ تو ہوتی چلی آئی ہے۔ یونہی چراغ سے چراغ جلتا رہتا ہے اور اسی طرح سے لوگ اپنی ننھی منی انا کو چمکا چمکا کے ذرّے سے اپنی دانست میں سورج بناتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ان افسانوں کے مصنفوں کے سامنے جیتے جاگتے ابن صفی کو کھڑا کردیا جائے تو وہ آنکھیں مل کر سوچیں گے کہ یہ کون سا شخص ہے کیونکہ ان غریبوں کو سوائے اس دھندلی سی شبیہ کے جو جاسوسی دنیا یا عمران سیریز کے پچھلے کور پر چھپی ہوتی ہے کبھی ابن صفی کو دیکھنے کو موقع ہی نہیں ملا۔ لہٰذا اس دھندلی سی شبیہ میں وہ بیچارے خود رنگ بھرنے کی کوشش نہ کریں تو اور کیا کریں اور اس کوشش میں اگر رنگ ضرورت سے زیادہ شوخ ہوجائیں یا بالکل مدھم ہوجائیں تو ان کا کیا قصور ہے۔

میرے سامنے اب بھی یہی الجھن ہے کہ جس ابن صفی کو میں جانتا ہوں اسے کس طرح آپ کو دکھاؤں کیونکہ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں، کوئی مافوق الفطرت قوت نہیں کوئی چونکا دینے والا ڈراما نہیں وہ تو ہماری آپ کی طرح کا ایک انسان ہے اور بس مگر جب میں رفاقت کے ان گزرے ہوئے بیس طویل برسوں پر غور کرتا ہوں تو دھیرے دھیرے اس کی بعض خصوصیات اس طرح ابھر کر اوپر آتی ہیں جیسے گلاب کی کلی صبا کے نرم جھونکوں سے آہستہ..... آہستہ کھلے اور اس کی خوشبو کی لہریں دھیرے دھیرے اس طرح پھیلیں کہ ان میں کوئی چونکا دینے والی کیفیت نہ ہو۔

جدید تہذیب کا المیہ یہ ہے کہ اس نے آدمی کو گھر سے جدا کردیا ہے، چاہے اسے معاشی عوامل کا نتیجہ کہیے یا تہذیبی عوامل کا بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ترقی کے چکر میں اگر انسان ایسی بہت سی چیزوں سے الگ ہٹتا جارہا ہے جن کے ساتھ صدیوں سے بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ بزرگوں کا احترام، بچوں پہ شفقت، عزیزوں سے محبت، گھر سے لگاؤ، کتنی ایسی باتیں ہیں جو..... ہماری اس تہذیب کا اساس ہیں جو سیکڑوں برسوں کے تجربوں کی بھٹی سے گزر کر ہمیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی ہیں اور مزید المیہ یہ ہے کہ ہم اس ورثے میں ملی ہوئی تہذیب پر فخر کرتے ہیں۔ دوسروں پر اس حد تک اس کی برتری جتاتے ہیں جو ان کی تحقیر کی مترادف ہے مگر اس تمام تر پروپیگنڈے..... کے باوجود خود اس پر عمل نہیں کرتے کہ وہ ہماری تیز رفتار زندگی کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔ واقعی دیوان خانے کی دنیا اور ڈرائنگ روم کی دنیا کے درمیان فاصلہ بہت بڑھ گیا ہے مگر ابن صفی نے گھر سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔ میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا ہے کہ گھر میں رہ کر وہ جتنا مطمئن اور خوش نظر آتا ہے اتنا اور کہیں نہیں رہتا۔ گھر اسے سکون دیتا ہے اور بچوں کا آنگن میں بے پناہ شور، اس کے ذہن کے لیے پس منظر کی موسیقی کا کام کرتا رہتا ہے، گھر سے دور ہوکر وہ اداس ہوجاتا ہے۔ اپنے آفس تو وہ مجبوراً جاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اگر اسے مہینوں گھر سے نہ نکلنے دیا جائے تو اسے پروا نہ ہوگی۔ بچوں سے اسے محبت ہے، بھرا پرا گھر اسے اچھا لگتا ہے، رشتے دار اور دوست احباب آتے جاتے رہیں تو وہ بہت خوش رہتا ہے، لوگ اس کی اس ادا کو پا گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ضروری ضروری کام بھی ملتوی ہوتے رہتے ہیں۔ بیوی چیختی رہتی ہے اور وہ گپ بازیوں اور خاطر مدارات میں لگا رہتا ہے۔ آخر وہ کسی سے کہے بھی تو کیا کہے حد تو یہ ہے کہ اس بے مصرف مشغولیت کے نتیجے میں اسے راتوں کو جاگ کر اپنی کتابیں مکمل کرنا پڑتی ہیں۔ ان راتوں کی بے خوابی کا نتیجہ وہ ایک بار بھگت چکا ہے جب وہ موت کے منہ میں جا کر واپس آیا تھا مگر اس واپسی کے سفر میں دو ڈھائی سال تک اسے چارپائی پر لیٹنا پڑا تھا۔ یار لوگوں کو یہ خداداد موقع ہاتھ لگا۔ وہ اسے کیوں جانے دیتے۔ چنانچہ محبت میں ناکامی اور اقدام خودکشی سے لے کر پاگل پن تک کیسے کیسے "چشم دید" افسانے نہیں تھے جو یار لوگوں نے نہ اڑائے ہوں۔ بہرحال یہ بیماری بھی ابن صفی سے گھر کے لگاؤ کو چھین نہیں سکی۔ شروع شروع میں تو بڑے زور و شور سے ڈاکٹری ہدایات کی پابندی ہوئی۔ زندگی کو باقاعدہ ٹائم ٹیبل کے خانوں میں بانٹا گیا۔ خوب چکر چلا پھر دھیرے دھیرے ٹائم ٹیبل پر گرد جمنی شروع ہوئی اور اب وہ گرد میں اتنا اٹ چکا ہے کہ پہچاننا بھی مشکل ہے کہ اصل شے کیا تھی اور دن بھر کی مہمان داری اور یار باشی کے بعد وہی آدھی رات کو ہی موصوف کو ناول لکھنے کا موقع ملتا ہے۔

کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے عمران کے ناولوں میں اس کی گھر سے دوری اور محرومی کا احساس خصوصاً "اماں بی اور ثریا کے کرداروں کے پس منظر میں کہیں خود ابن صفی کے گھر سے لگاؤ کے ردعمل کا نتیجہ تو نہیں ہے جو کبھی کبھی فریدی کے ناولوں میں حمید جیسے شوخ و شنگ کردار کی بے نام اداسی اور قاسم کی بیوی کے ہوتے ہوئے بیوی سے محرومی کی صورت میں ملتا ہے اور یوں ہماری جدید تہذیب سے ابن صفی یہ کہنا چاہتا ہے کہ دیکھو یہ ہوتا ہے ترقی کی دوڑ میں گھر سے محروم ہونے کا نتیجہ مگر یوں بھی ہے کہ طنز کا یہ نشتر محرومی کے زخم کو اور گہرا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ ہماری پوری نسل ہی بے گھر اور بے در ہو چکی ہے۔ گھر سے کچھ رشتے ہم نے توڑ دیے اور کچھ ہم سے تڑوا دیے گئے اور جو ماشاء اللہ گھر والے ہیں وہ اس احساس محرومی کو اور بڑھا رہے ہیں۔

ابن صفی کے ناولوں کا ایک بڑا عنصر ہمدردی اور انسان دوستی کا ہے۔ یہ بھی ابن صفی کی اپنی شخصیت کا ایک پرتو ہے۔ اس کے سینے میں دلِ دردمند ہے۔ میں نے اس کے یہاں سے کسی کو خالی ہاتھ جاتے نہیں دیکھا۔ اس کا بس نہیں چلتا ورنہ وہ اپنے کپڑے بھی دے دے۔ لوگ عجیب عجیب طرح کے بہانے بنا کر اس سے مانگتے ہیں، اسے کاٹتے ہیں اور وہ بعض اوقات تو جان بوجھ کر کٹتا ہے۔ ایک صاحب آئے اور میری موجودگی میں..... صورت سوال بنا کر کچھ روپے لے گئے مگر مجھے بڑا سخت طیش آیا جب ایک حلقے میں انہیں میں نے ابن صفی کی مالی بدحالی کا ماتم کرتے پایا۔ وہ بڑے خلوص سے فرما رہے تھے۔ "ابن صفی غریب کیا کرے۔ بیماری سے اٹھنے کے بعد بیچارے سے لکھا ہی نہیں جاتا۔ تین تین مہینے کے بعد کتاب آتی ہے۔ میں نے دو ہزار دیے تو اس کا کام چلا۔" میں نہ رہ سکا۔ میں نے انہیں وہ رقم یاد دلانے کی کوشش کی جو وہ میرے سامنے لائے تھے۔ پہلے تو وہ ذرا گڑبڑا دیے پھر مجھے گھورا اور پھر بڑی بے نیازی سے بولے کہ وہ تو اس نے میرا پچھلا قرض ادا کیا تھا۔ میں غصے میں بھرا ہوا ابن صفی کے پاس پہنچا مگر اس نے میری ساری بات قہقہے میں اڑا دی۔ وہ صاحب اب بھی ابن صفی کے پاس آتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اب بھی وہ کچھ نہ کچھ ضرور لے جاتے ہوں گے اور اب بھی محفلوں میں بیٹھ کر ابن صفی کی امداد کرتے ہوں گے کیونکہ اب بھی اس کی کتابیں تین تین ماہ کے بعد آتی ہیں۔ ایک اور صاحب کا ذکر یاد آگیا۔ ابن صفی کے جانثار عاشقوں میں سے تھے۔ عقیدت کی انتہا یہ تھی لاہور سے بذریعہ طیارہ ابن صفی کی زیارت کو آیا کرتے تھے۔ مدتوں اس امر کے لیے کوشاں رہے کہ ابن صفی اپنی کتابوں کے ایڈیشن لاہور سے نکالنے کے حقوق انہیں دے دیں تاکہ وہ بھی دل کھول کر ابن صفی کی خدمت کر سکیں۔ آخر ان کا اخلاص رنگ لایا۔ انہیں حقوق دے دیے گئے انہوں نے دھڑلے سے کتابیں چھاپنی شروع کر دیں۔ خیر صاحب کتابیں چھپتی رہیں اور گرما گرم سموسوں کی طرح بکتی رہیں مگر حسابِ دوستاں در دل ہی رہا۔ شروع شروع میں تو ابن صفی مروت میں خاموش رہے مگر تابہ کے ادھر سے سوال ہوا۔ ادھر سے ٹال مٹول ہوئی اور جب یہ معاملہ ہجر و وصال اپنی انتہا کو پہنچا تو انہوں نے ایک حساب نامہ بھیج کر ابن صفی کے چودہ طبق روشن کر دیے۔ ساری سراغ فہمی دھری کی دھری رہ گئی۔ کیونکہ اس فردِ حساب کی رو سے ابن صفی کو کچھ دینے کے بجائے وہ خود اس سے آٹھ دس ہزار کے طلب گار تھے تاکہ اپنا وہ نقصان پورا کر سکیں جو انہیں ابن صفی کی کتابیں چھاپنے سے برداشت کرنا پڑا ہے۔ اس معاملے نے خاصا طول کھینچا مگر قدرتی طور پر اس کا ڈراپ سین یوں ہو گیا کہ ابن صفی کے وہ عقیدت مند کسی غبن کے سلسلے میں پکڑے گئے۔ مقدمہ چلا۔ مجرم پائے گئے اور آٹھ سال کے لیے سرکاری مہمان خانے کے مکین بنا دیے گئے۔ ابن صفی نے ایک دوسرے غیر عقیدت مند کو حقوق دے دیے جن کے ساتھ غالباً اب بھی خوش اسلوبی سے معاملات نبھ رہے ہیں۔ اس طرح ابن صفی کو ایک بہت بڑے دردِ سر سے نجات ملی مگر مجھے اس وقت بڑی سخت حیرت ہوئی جب

مجھے یہ معلوم ہوا کہ مقدمے کا فیصلہ ہوجانے کے بعد سے اس عقیدت مند کے بے یارومددگار بیوی بچوں کو ابن صفی کی طرف سے ایک مقررہ رقم ماہانہ مل رہی ہے۔

حسن، ابن صفی کی کمزوری ہے چاہے وہ نغمے، شاعری یا تصویروں میں ہو یا چہروں اور قدرتی مناظر میں۔ ایسے موقعوں پر اس پہ ایک عجیب کیفیت طاری ہوجاتی ہے جیسے بیٹھے بیٹھے کہیں کھوگیا ہو۔ یوں تو موصوف نے شکار کے لیے ایک بندوق بھی پال رکھی ہے مگر اس سے وہ وہی کام لیتا ہے جو اورنگزیب اپنے ستار سے۔ کبھی کبھی موصوف پر بڑی زور سے، شکار کا حملہ ہوتا ہے۔ بندوق نکالی جاتی ہے، صفائی ہوتی ہے۔ یاردوست جمع ہوتے ہیں۔ شکار کا پروگرام بنتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ سوائے ان جانوروں کے جو خود ہی اس کی بندوق کی نال میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں اور کسی دوسرے کا خون اس کی بندوق کے سر نہیں ہے مگر ان شکار کے دوروں کا ایک فائدہ ضرور ہے۔ وہ جو ابن صفی کے ناولوں میں مناظر کی ایک اجلی اجلی جانی پہچانی رنگین و دلآویز تصویر ملتی ہے وہ شاید شکار ہی کی دین ہے۔ رہ گئی اس کی شاعری تو وہ بھی اس کے شکار ہی کی طرح ہے۔ بے حد کم مگر بے حد خوب صورت، بھرپور اور حواس پر چھاجانے والی۔ اگر وہ کہیں سنجیدگی سے شاعری کرلیتا تو بہت سے چراغ گل ہوگئے ہوتے۔

اسے زندگی پر مصنوعی پابندیوں سے نفرت ہے، زندگی، کھری، سادی اور صاف ہونی چاہیے مگر معاشرے کے لیے، اس کی فلاح وبقا کے لیے وہ پابندیاں ضروری سمجھتا ہے، ہر آزادی کی ایک حد ہے۔ اس کے آگے نہیں۔ جہاں تمہاری آزادی کی حد ختم ہوتی ہے وہیں سے میری آزادی شروع ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جرائم نویسی کرنے کے باوجود وہ قانون کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ ایک مرتبہ نئے کرداروں کی بات ہورہی تھی۔ میں نے پوچھا کہ یار تم نے "سینٹ" جیسا کوئی کردار تخلیق کیوں نہیں کیا۔ لوگ ایسے کردار کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ کہنے لگا اس سے لوگوں کے ذہنوں سے قانون کا احترام اٹھ جاتا ہے اور ایک مرتبہ جب قانون کا احترام اٹھ جائے تو جنگل کے قانون میں فرد اور معاشرہ ہی نہیں بلکہ قوم اور ملک بھی نہیں بچ سکتے یہی وجہ ہے کہ میرے ہر ناول میں تمہیں قانون کے احترام کا پرچم بلند ہی ملتا ہے۔ یہ فریدی، یہ حمید، یہ عمران خود اسی کی شخصیت، تمناؤں اور حسرتوں کی مختلف جھلکیاں ہیں۔ جن کے روپ میں وہ اپنی تحریر کے خواب زاروں میں قانون کا پرچم بلند کرتا ہے اور انسانیت کے چہرے پر عظمت کا غازہ سجاتا ہے۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ اس کے بہت سارے کردار خود اس کے یار دوستوں کے حلقے ہی میں موجود ہیں۔ ہاں ان کی شکلیں اس نے پلاسٹک میک اپ کیے بغیر ہی ایک ذرا تبدیل کردی ہیں مگر کوشش کرکے انہیں پہچانا جاسکتا ہے۔ چند ایک سے تو میں ذاتی طور پر واقف ہوں اور اگر خوف فسادِ خلق کا خطرہ نہ ہوتا تو بخوشی ان کی چہرہ کشائی کی سعادت حاصل کرتا خیر تو بات قانون کے احترام کی ہورہی تھی۔ قانون کا یہ احترام درحقیقت اس کے انتہائی گہرے مذہبی شغف کی دین ہے۔ وہ اندر سے بے حد مذہبی ہے اور قانون کا اصل سرچشمہ تو خدا کی ذات ہی ہے۔

ابن صفی کا مطالعہ بڑا وسیع ہے۔ تقریباً "سارا قابل ذکر نثری ادب اس نے پڑھ ڈالا ہے مگر اس کی یہ البیلی اچھوتی دل میں اتر جانے والی نثر قطعی اس کی اپنی ہے، اس کے سوتے خود اس کی ذات، شخصیت اور تجربے کی جھیل سے پھوٹے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوشش کے باوجود اس کے بے شمار نقال اس کی نثر کی خوشبو نہیں اڑا سکے اور جو اس کی تحریروں میں کہیں کہیں آسمانی بجلی کی لہروں کی طرح طنز کی گہری جھنجوڑ ڈالنے والی کاٹ ملتی ہے وہ بھی ابن صفی کا اپنا حصہ ہے۔ ادب کے پرانے پڑھنے والے اب تک طغرل فرغان کو نہیں بھولے جس نے اپنی تحریروں سے طنز کے میدان میں ایک نیا سنگ میل قائم کیا تھا اور پھر وہ طغرل فرغان غائب ہوگیا۔ خوش درخشندہ ولی شعلہ مستعجل بود۔ یہ طغرل فرغان ابن صفی ہی کا ایک روپ تھا۔

سراغ نگار نے طنز نگار کو نگل لیا مگر وہ اسے فنا نہیں کرسکا۔ اب بھی طنز نگار سراغ نگار کے دل میں نشتر کی طرح کھٹکتا رہتا ہے۔ کاش کوئی ابن صفی کے ناولوں سے طنز کے یہ اچھوتے ٹکڑے جمع کرسکے تو ہوسکتا ہے کہ طنز میں ایک نئے دور کا آغاز ہوجائے۔ اسی طرح شاعری میں اسرار ناروی، ابن صفی ہی کے چہرے کا نقاب ہے۔ نجانے اس شخص نے اپنے چہرے پر کتنی تہیں چڑھا رکھی ہیں۔ یوں شاعری میں بھی پڑھ سب ہی کو رکھا ہے مگر مانتا تین ہی کو ہے یعنی میر، مرزا اور میراجی کو۔ ان تینوں میں جو نفسیاتی قدر مشترک ہے شاید وہی اس پسندیدگی کی وجہ ہے۔

وہ دن گزر گئے جب اردو میں جاسوسی ادب سے سوتیلے بچے کا سلوک کیا جاتا تھا اور سراغ نگاری سے ادبی طہارت میں خلل واقع ہونے لگتا تھا۔ اب ادب کا قافلہ ادبی رسالوں کے دور سے نکل کر ڈائجسٹوں کے دور میں داخل ہوگیا ہے اور بڑے جغادری ادیب جو ادب کی حرم سرا کے محافظ تھے اب بڑے ذوق و شوق سے نہ صرف ڈائجسٹوں اور فلمی رسالوں میں چھپتے ہیں بلکہ ان کی لوح پر بحیثیت نگران اعلیٰ، نگران اور مدیر کے اپنے نام جلی حروف میں لکھواتے ہیں اور جن کو اس کا موقع نہیں ملتا وہ اپنا نام حلقۂ ادارت میں شامل کرا کے ہی خوش ہوجاتے ہیں مگر اس قافلے کو یہاں تک لانے کا سہرا ابن صفی ہی کے سر ہے۔ اگر وہ اپنا قلم سراغ نگاری کے لیے وقف نہ کرتا تو شاید ہم اب بھی بیس سال پہلے کے دور ہی میں ہوتے۔